غالب کی آپ بیتی

مرزا غالب کی تمام اُردو تحریروں سے مرتب کی ہوئی خود نوشت سوانح عمری،

نثار احمد فاروقی

علمی
مجلس
دلّی

غالب کی آپ بیتی

یعنی مرزا غالب کے خطوط سے انھیں کے لفظوں
میں ترتیب دی ہوئی مکمل سوانح حیات جس کا
ہر لفظ مستند ہے

مرتبہ
نثار احمد فاروقی
دلّی کالج، دلّی یونیورسٹی، دلّی
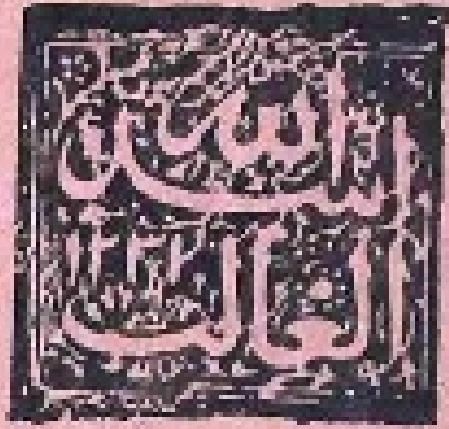
علمی
مجلس
دلّی

سلسلہ مطبوعات علمی مجلس دلّی ۲۴

سالِ طباعت: فروری ۱۹۶۹ء
سالِ اشاعت: فروری ۱۹۷۱ء
مطبع: کوہ نور پریس، دہلی
ناشر: ظلّ عباس عباسی
قیمت: ڈھائی روپے

فہرس

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عزّ ورود لایا تنخواہ جولائی سنہ ۱۸۶۶ء
کا مبلغ سو روپیہ از روئے ہنڈوی مرفوقہ معروض وصول میں آیا۔ اگرچہ یہاں بھی مینہ
اسیقدر برسا ہے مگر جنگل پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع کا امیدوار ہوں لیکن
مگر چونکہ بفرمان ازلی میں رزق کی برات آپ پر ہے اور آپکے ملک میں
بارش خوب ہو گئی ہے ابر رحمت کی شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی
کے بھیجتا ہوں بنظر اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
جمعہ ۱۰ اگست ۱۸۶۶ء

شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مدظلہ

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہم و ہم اسد اللّٰہیم

عرض بساط

غالب ایک شاعر ہی نہیں ایک عہد اور ایک تہذیبی علامت ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ مغلوں نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں: تاج محل، اردو اور غالب۔ یہ تینوں ایک ہی تہذیبی وحدت کے مختلف مظاہر ہیں۔ تاج محل کے سنگ و خشت کو اگر لفظ و بیان میں تحلیل کر دیا جائے تو وہ غالب کی شاعری سے مختلف کوئی شے نہیں ہوگی۔ اور غالب کی شاعری اردو میں اظہار و ادا کے امکانات کا سب سے حسین، توانا اور دلکش مظہر ہے!

شاید ہندوستان میں کسی اور زبان کے شاعر کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل پر یکساں گرفت رکھتا ہو۔ غالب اپنے عہد میں بھی سر برآوردہ تھا اور آج بھی سب سے زیادہ قد آور ہے اور کل بھی اس کے خیال کی رفعتوں کے سامنے پست قد یوں ہی نظر آتا ہے۔ یقین ہے کہ آنے والی نسلیں غالب کو انبساط و انقباض، کرب و نشاط اور رنج و راحت کے ہر موڑ پر اپنا ہم نوا اور شریک پائیں گی۔ وہ لمحوں کا شاعر ہے، مگر یہ لمحے قید مکان و زمان سے آزاد اور حلقۂ شام و سحر سے ماورا ہیں۔ اس کے شعروں میں جذبات کے گریزاں سائے اور محسوسات کی پرچھائیاں ایک بے بس قیدی کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ اُس کی عظمت کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ وہ "معمولی" انسان ہے۔ ہماری طرح کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے، کبھی گنگناتا ہے، کبھی کڑھتا ہے۔ جب تک بنی نوع انسان پر یہ کیفیات گزرتی رہیں گی غالب کو بھلایا نہیں جا سکتا!

شاعری کی طرح اس کے خطوط بھی ایک معمولی انسان کی غیر معمولی سرگزشت ہیں۔ آج

سے ایک صدی پہلے کے سماج میں ایک نابغہ (Genius) کس طرح بسر کرتا تھا۔ اس کے مشاغل، مصروفیات، آرزوئیں، ولولے، حوصلے، ناکامیاں، ابھرتی تسلیاں، مصائب اور مکارہ، کس طرح اسے چاروں طرف سے اپنے نرغے میں لئے ہوئے تھے، وہ کیسا شاعر تھا، کیسا مفکر تھا، یہی نہیں ایک اُستاد، ایک شوہر، ایک ہمسایہ، ایک درباری اور ایک دوست کی حیثیت سے وہ کیا تھا، کتنا بلند اور گھٹیا تھا، کیسا خوشامدی اور خوددار تھا — یہ سب رنگا رنگ جلوے اُس کے خطوں میں ملیں گے، جن کا ہر فقرہ جہانِ معنی ہوگا، ہر لفظ عالمِ عالم کیفیات لئے ہوگا۔۔۔ غالب کے سوا نہ دوسرے کسی شاعر کے اتنے اور ایسے خطوط ملتے ہیں، نہ اتنی سحرکار شخصیت سے ہم کہیں دوچار ہوتے ہیں۔ میر یقیناً بڑا شاعر ہے مگر ان باتوں میں وہ بھی غالب کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی ہی نے کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ غالب اُن شخصیتوں میں سے ہے جن کے لئے ہمیں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ ہم ان کے عہد میں ہوتے اور اُن سے دوستی کرتے۔ غالب کی بوقلموں شخصیت کی تعریف میں اس سے زیادہ بلیغ بات نہیں کہی جا سکتی۔ یہ بھی سہل ممتنع ہے، یہ جتنی چھوٹی اور واقعاتی نفسیاتی حقیقت ہے اسے بیان کرنا اُتنا ہی دُشوار تھا۔ خود میں نے بھی جب جب غالب کے اشعار سے لُطف اُٹھایا ہے یا اُن کے خطوط کا مطالعہ کرتے کرتے اسی ماحول میں کھو گیا ہوں تو بے تحاشا دل میں یہی تمنا جاگ اُٹھی ہے، کاش ہم اس انسان سے دوستی کرتے۔ اس کی باتیں سنتے اور اُسے اپنی ان آنکھوں سے دیکھتے!

غالب نے ۷۲ سال کی زندگی پائی۔ اور یہ زندگی بڑی ہموار گزری۔ اس میں کسی بلند نصب العین کے لئے کوئی جدوجہد یا ہمہ وہ ہنگامہ نہیں ہے۔ اس میں بھی ابتدائی ۴۰ سال کے حالات پر بہت کم مواد ملتا ہے۔ مقدمۂ جاگیر اور سفر کلکتہ کے بارے میں مطبوعہ فارسی خطوط کے علاوہ کچھ معلومات ان نئے خطوط سے ملتی ہیں جو غالب صدی کے موقع پر شائع ہوئے ہیں۔ پھر غالب کے اُردو خطوط ۱۸۴۸ء سے ملنے شروع ہوتے ہیں ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ خطوطِ غالب مرتبہ مہر میں ۱۸۵۱ء تک فی سال ایک خط ملتا ہے، ۱۸۵۲ء کے پانچ، ۱۸۵۳ء کے سات، ۱۸۵۴ء کے پانچ

اور ۵۶ - ۱۸۵۷ء کے تین تین خطوط ملتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۸ء تک صرف دس سال کا وقفہ ایسا ہے جس میں اُردو خطوط کی تعداد چار سو سے زائد ہے۔ یہی زمانہ ہے جب غالب نے زیادہ تر اردو نثر میں لکھا ہے اور اپنی زندگی کی شب و روز کی جزئیات تک قلم بند کر دی ہیں۔

حیرت یہ ہے کہ غالب جیسے عبقری کو اپنی سوانح عمری خود لکھنے کا خیال نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں گوشہ نشین ہو کر انھوں نے 'برہان قاطع' کی قطع و برید میں جو وقت کھپایا اگر یہ فرصت اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات و حادثات اور ادبی تجربات و محسوسات کی پیوند کاری میں صرف کرتے تو اردو زبان کو ایک ایسی تصنیف دے جاتے جو عظمت و رفعت میں کسی طرح دیوانِ غالب سے کم نہ ہوتی۔ مگر اس زمانے تک اردو میں سوانح عمریوں کا رواج نہیں ہوا تھا، خود ستائی کی دوسری شکلیں تو رائج اور پسندیدہ تھیں مگر یہ اسلوب اجنبی تھا اس لئے غالب نے 'برہان قاطع' کی نفی سے اپنی فارسی دانی کا اثبات کرنا چاہا۔

بہر حال اُن کے خطوط اور معاصروں کے بیانات سے ہمیں جتنا مواد ملتا ہے اتنا اُردو کے کسی شاعر کے بارے میں نہیں ملتا۔ میر نے باوجودیکہ اپنی سرگزشت "ذکر میر" کے نام سے لکھی ہے مگر اس سے اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میر دہلی کے کون سے محلے میں رہتے تھے۔ وہ زیادہ تر صوفیانہ کلمات اور مغلوں کے دورِ آخر کی غیر مستحکم تاریخ کا مبہم بیان بن کر رہ گئی ہے۔ اس لحاظ سے بھی غالب بڑا خوش نصیب ہے کہ اس کی زندگی اور تصانیف سے متعلق بہت ہی کم چیزیں ایسی ہیں جو ہماری دسترس سے باہر رہ گئی ہوں۔

ابھی اپریل ۱۹۶۹ء میں دیوانِ غالب کی روایتِ اوّلیں جو خود غالب کے قلم سے لکھی ہوئی ہے اور "نسخۂ امروہہ" کے نام سے معروف ہے، دریافت ہو کر شائع ہو چکی ہے جب کہ میر و سودا یا درد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک غزل بھی ہمیں نہیں ملتی۔ اس کے نئے خطوط بھی اب تک کہیں نہ کہیں سے برآمد ہوتے جاتے ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے رسالہ 'آج کل' دہلی میں جناب محمد عتیق صدیقی کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں غالب کی زندگی کے حالات اس کے خطوط کی عبارتوں کو جوڑ کر بیان

کئے گئے تھے۔ یہ خیال مجھے پسند آیا اور جب ۱۹۶۳ء میں "نقوش" (لاہور) نے آپ بیتی نمبر کے مضامین کا مطالبہ کیا تو میں نے غالب کے اُردو خطوط کی مدد سے ایک مفصل آپ بیتی تیار کر کے بھیج دی جسے عام طور پر بہت پسند کیا گیا۔ اس کے شائع ہونے کے بعد میری کتاب "تلاشِ غالب" کی کتابت شروع ہو چکی تھی۔ یہ مضمون اس میں شمول کے لئے ۱۹۶۵ء ہی میں کتابت کرا دیا گیا۔ اگرچہ تلاشِ غالب اب کہیں غالب صدی کے موقع پر شائع ہو سکی ہے۔ بعد کو مجھے خیال آیا کہ یہ آپ بیتی اور بھی بڑھائی جا سکتی ہے، اس کی ترتیب میں بھی کچھ نقائص رہ گئے ہیں وہ دُور ہونے چاہئیں۔ مگر فی الحال یہ میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

اس آپ بیتی کے ساتھ ایک لطیفہ اور بھی ہوا ہے۔ میرے بعض قدر دانوں نے اسے اتنا پسند کیا کہ اِدھر اُدھر سے عنوانات بدل کر اسے جوں کا توں کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ یہ بھی کسی اہلِ قلم کے مقبول ہونے کی نشانی ہے کہ اس کی محنت کو لوگ اپنے نام سے منسوب کر کے فخر حاصل کرنے لگیں۔ لہٰذا یہ سطریں شکایت کے لئے نہیں تحدیثِ نعمتِ رب کے طور پر لکھ رہا ہوں۔

یہ آپ بیتی، مختصر ہے اور تشنہ بھی۔ لیکن تشنگی اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ غالب کے بارے میں آپ زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ خود ہی ہم کلام ہو تو آپ کی گرویدگی کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ:

آواز پہ مرتا ہوں میں ہر چند سر اُڑ جائے
جلّاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

دوسرے اس میں عبارتوں کے حوالے ہونا چاہئیں۔ یہ خطوطِ غالب میں اس طرح منتشر ہیں کہ اب انھیں تلاش کرنا بھی اچھی خاصی تحقیق ہو جائے گی۔ میں نے نقشِ ثانی کے لئے یہ حوالے بھی فراہم کر رکھے ہیں۔

نثار احمد فاروقی

دہلی کالج، دہلی
یوم جمہوریہ ۷۱ء

غالب کی آپ بیتی

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

خاندان

میں اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، غالب تخلص، قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ میرا ہم قوم سراسر قلمرو ہند میں نہیں، سمرقند میں دو چار، یا دشت قبچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ہاں اقربائے سببی ہیں:

غالب از خاک پاک تورانیم　　　لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی　　　بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک　　　در تمامی ز ماہ دہ چندیم

میرا دادا قوقان بیگ خاں ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت سمرقند سے ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے، نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ پہاسو، جواب سمرو بیگم کو سرکار سے ملا تھا، سیر حاصل، ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اُس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں بہادر دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چندے حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا، راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔

کافی بود شاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ در پدرم را بود مزار

نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے بھی بالا بستہ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ اُس نے اپنے زور بازو سے سونک اور سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہو لکر کے سواروں سے چھین لیے۔ جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات، علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھے کہ دس مہینے بعد ہاتھی پر سے گر کر بمرگِ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا، ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔

عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے۔ لمن الملک الیوم؟ اور آپ جواب دیتا ہے: للہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء، یک شنبہ) میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

تاریخ ولادت من از عالم قدس
ہم شورش شوق "آمد" و ہم لفظ "غریب"

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔

ایام آگرہ

پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ایام دبستان نشینی میں شرح
ۂ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک
یا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان
م کی نسل میں سے تھا، معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن
حد اور صوفی صافی تھا، میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس
ا۔ غوامض فارسی آمیختہ بعربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج
تھا۔ زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت
س زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہوگئی۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے
گر دعویٰ اجتہاد نہیں۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔

ناظر بنسی دھر کے والد عہد نجف خانی و ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ
غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو (انھوں نے بھی)
کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب جوان ہوا تو میں نے
دیکھا کہ بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں
دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ
ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس کی
میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط و محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی،
چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور
ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے
جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست
تھی اور پاس اس کے ایک گھٹیا والی حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑا کہ وہ گڈریوں والا

کہلاتا تھا اور ایک کٹڑا کشمیری والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا
تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی پیش دست
رہتا تھا اور کٹڑوں کا کرایہ اوگاہ کر جمع کراتا تھا۔

سفر کلکتہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

چچا کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب
احمد بخش خاں، دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے مگر سات ہزار روپیہ سال
اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ وہ
اب تک پاتا ہوں۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔

سنہ ۱۸۰۳ء میں کلکتے گیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر
سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریذیڈنٹ معزول ہوگئے، سکرتر گورنمنٹ بمرگ
ناگاہ مرگئے۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔
ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔

زاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ
دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے۔ میری براءت کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس کے
بعد پنڈ چھوٹا، خلعت معمولی ملا۔ غرض یہ کہ خلعت ریاست کا ہے، عوض خدمت نہیں۔

اللہ اللہ کلکتے میں جو شور فساد اٹھا تھا۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔ میرا شعر ہے

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

خستہ جراحت ہائے اعتراض ہوا۔ منشا اعتراض یہ کہ عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ
بحسب اجتہاد قتیل ممنوع ہے۔ قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ

میں آیا تھا۔ کفایت خاں اُس کا نام تھا، اُس تک یہ قصّہ پہنچا، اُس نے اساتذہ کے اشعار پان سات ایسے پڑھے جن میں "ہمہ عالم" و "ہمہ روز" و "ہمہ جا" مرقوم تھا اور وہ اشعار "برہانِ قاطع" میں مندرج ہیں۔

چکنی ڈلی

"فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن" کی بحر میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتے میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے، انھوں نے ایک مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لے لی۔

اب سوچ رہا ہوں جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ چکنی ڈلی　　زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے　　ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیے
اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے　　خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسود دیوارِ حرم کیجے فرض　　نافہ، آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز　　میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرانگشتِ حسیناں لکھیے　　سرِ پستانِ پری زادسے مانا کہیے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ آخری بیت ہے:

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں:

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد　　زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی

میں میرا وہاں جانا ہوا تھا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا اور ادھر کو نہ آتا۔

عبادت خانۂ ناقوسیان است　　ہمانا کعبۂ ہندوستان است

ایک مثنوی میں نے اُس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغِ دیر" اُس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

اُفتد و دانی

شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمرّدیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بد دور وہی ایک حور ـــ

زن نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مُغل بچّے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اُسے مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ چالیس بیالیس برس کا واقعہ ہے، باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا:

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی　　عشقِ محمد بس است و آلِ محمد

اللہ بس ماسوی ہوس۔

حُلیہ

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا۔ بساطی۔ نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا۔ جولاہا۔ کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈا دیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں۔

دربارِ اودھ

ایک قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گذرا اور جس دن گذرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا، متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گذری؟ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے۔ دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ اس نے ہنوز تم کو کچھ نہیں بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ

بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں۔ اور ناسخ کیا کرے؟

امجد علی شاہ (۱۸۴۲-۴۷ء) کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے، کسی زمانے وارد اکبر آباد ہوئے تھے، کبھی کہیں کے تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔ زبان آور اور چالاک۔ اکبر آباد میں نوکری کی جستجو کی، کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں ایک دو بار آئے تھے۔ پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلّی میں آ رہا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بسبیل ڈاک آیا۔ چونکہ ان دنوں میرا دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا، میں نے جانا کہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں پہلے مجھ کو یہ مصرع لکھا:

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

آپ سے جدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا، وہاں سے دو برس بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ میں آیا ہوں اور وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے خان اور بہادر کا خطاب دیا ہے۔ مصاحبوں میں نام لکھا ہے۔ مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں، وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجیے تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی بیت اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آں کہ بہ ذوقِ وطائے او　　صد رہ نماز صبح قضا کرد روزگار

ستردو تھا کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آگئی صرف۔ پھر دو ہفتہ بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا۔ وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ بہ آئین شایستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مُہرکن سے مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجیے۔ چاندی کا نگینہ ہو، مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کرکے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گزرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے جو خط بھیجا، اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط۔ بہادری کی مُہر تم سے بہ فریب حاصل کرکے مرشد آباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیے تھے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہو گئی۔

چودہ پارچے کا خلعت ایک بار، اور ملبوس خاص، شال، رومال، دوشالہ ایک بار۔ پیش گاہ حضرت سلطان عالم (واجد علی شاہ) سے پا چکا ہوں۔ مدح کی فکر نہ کرسکا۔ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گذرا نہ تھا۔ میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا۔

حیدرآباد

صنعت سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا، کچھ قدردانی نہ فرمائی۔ ردّ و قدح، وہابیہ میں ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی، وہ بھی محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس اناولاغیری بجا رہے ہیں۔ اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر برس کی میری عمر ہوئی۔ سوائے خشک

شہرت کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ احسنت و مرحبا کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر ستایش کا حق ستایش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے۔

ایسے طالع مرتی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں نے والی دکن کی طرف رجوع کیا، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا۔ یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی و واقعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کرکے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا۔ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیونکر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

دسواں نمبر

میں انگریزی ریاست میں علاقہ ریاست دو دانی کا رکھتا ہوں، معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ و سرپیچ مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوزی یہاں آئے نہیں۔ اب زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ میرے بڑے مربی قدردان، جناب ایڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے۔ لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔

تاریخ نگاری

دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا، اُن کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت "تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ" مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے، بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔

اب وہ بات گئی گذری، بلکہ اب وہ کتاب چھپانے کے لائق ہے نہ چھپوانے کے قابل اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔

دہلی بعد غدر

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اُسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگذشت لکھنا شروع کی:

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت درپیش آئے، شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چندے مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں

نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب کیا، دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نریندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند اور اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف سے بادشاہی دفتر میں سے، یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زندان کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟ وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالبؔ
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

روپوش نہیں ہوں، بُلایا نہیں گیا، دارو گیر سے محفوظ ہوں مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی روبکار نہیں آیا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی کو درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے، پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت — غمِ مرگ میں قلعۂ نو مبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟

غمِ فراق — حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں، عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مرگیا، اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج — جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔ اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز یہ باہر۔ مداری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم ہے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بقدرِ سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں۔

قلزمِ خون

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟

خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی، کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینے کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے تمام لوگ اس موضع میں آباد ہو گئے تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہونگے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ میر ہیچ زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شناور

رہا ہوں، دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔

دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر ۱۸۵۹ء کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھئے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں جو باقی رہے۔ اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی و حصار۔ پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر اُن دونوں کو یہاں لے آئے تو تین، ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلی ماروں میں یہ سگ دنیا موسوم بہ اسد بقول مردود، مطرود و محروم و مغموم۔

توڑ کر بیٹھے ہیں ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

ہو کا مکان

اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ مصیبت عظیم یہ کہ کھاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری پانی ہی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، جامع مسجد راج گھاٹ کے دروازے کو پیدل۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ کے دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر

ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں، واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلی واللہ اب شہر نہیں، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخندانی۔ کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں۔ پنشن داروں سے حاکم کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی بیوی، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑا دی۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنسن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔

جامع مسجد کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے اُن کے جواب

گئے ہیں یقین ہے کہ واگذاری کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

تیشے کی طغیانی

یہاں شہر ڈھے رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلنذ کی طغیانی سے مکان گر گئے۔ غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے، میوہ اناج کے مول بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں بارہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ کنوار کا مہینہ جسے "جاڑے کا دوار" کہتے ہیں، پانی گرم، دھوپ تیز، لو چلتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔

کشمیری کٹرہ بگڑ گیا ہے۔ ہائے وہ اونچے اونچے درا اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں وہ دوڑ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں، آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہ گذر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے فیل خانہ خلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرا دئے گئے۔ جلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ راج گھاٹ ڈھانا چاہتے ہیں۔ اہل قلم بچاتے ہیں، پایان کار دیکھیے کیا ہو۔

آج کل یہاں پنجاب کے احاطے کے بہت کم حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی ۲ نومبر ۱۸۵۹ء کو جاری ہوگی۔ سالگ رام خزانچی، چھنا مل، ہمیش داش، ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا، غلے اور اپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا اژدہام ہے۔ آگے حکم دیا کہ مالکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں (۱۷ نومبر ۱۸۵۹ء) سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی آ رہیں مگر کرایہ سرکار کو دیں۔

احکام قضا و قدر

حکیم احسن اللہ کے مکانات شہر والوں کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ، دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب حامد علی خاں کے سب مکانات ضبط ہو گئے۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کو نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا، مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکانات کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟

جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے، نہ پنسن رکھتے تھے۔

زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یا بارہ مہینے سال آئندہ (۱۲۷۷ھ) کے اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ حاکم کا خوف نہ مخبر کا خطرہ۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے نہ کپڑا خریدنا پڑے، نہ گوشت گھی منگاؤں، نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سراسر سرور۔

یارب این آرزوے من چہ خوش است
تو بدین آرزو مرا برسان

زبان زد خلق ہے کہ تقدیر نوروں سے باز پرس نہیں۔ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اے لو کئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیے کیا تقدیر کیا ہو۔ جو کچھ ہوا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ... خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنسن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی ...

بہنیں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے، تمہاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تنزل کیا قہر ہوگا۔

میں خود موجود ہوں۔ حکّامِ صدر کا روشناس۔ پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ تین برس کا پنشن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ ٹیلک، اور بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ طلب ہے نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔

جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں، اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت (۱۵ جولائی ۱۸۵۹ء) کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دو سڑکیں

یہاں دو سڑکیں دو طرفی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا۔ اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ جنوب کی دکانیں، بھلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اتو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی کے اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں، جب اہل شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟

بڑھاپا، ضعفِ قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعتِ فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں، نہ گنہگار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو، اگر یہاں دربار

ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا، محمد فضل مصوّر کو دیا، یہ اس کا مطلع ہے:

ز سالِ نو دگر آبے بروئے کار آمد

ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی سرگزشت لکھنے کا کیا ہے۔ اس بجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اسلوب ہے!

پنشن کا اجرا

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ فروری ۱۸۵۹ء کو میں گیا۔ جب شکار کو سوار ہو گئے تھے، میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو، سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے کیا خلعت مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت سے گیا تھا وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا۔ تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

حاکمِ پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنشن کی پرسش سے کیا غرض تھا؟ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے۔ یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے روز یکشنبہ یوم تعطیل تھا دوشنبہ ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا اچھا توقف کرو۔ بعد تھوڑی دیر کے کہ کچہری کی چھٹی ہوئی سواری مانگی۔ جب سواری آ گئی۔ باہر نکلے۔ میں نے کہا وہ کتابیں حاضر ہیں۔ کہا منشی جیون لال کو

دے جاؤ۔ وہ ادھر سوار ہو گئے، میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۵۹ء کو پھر گیا۔ بہت اختلاط اور التفات سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا۔ وہ دیکر یہ التماس کی کہ یہ کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ بہت اچھا کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمہاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر کو کچھ لکھا ہے تم اُن سے ملو۔ عرض کیا۔ بہتر۔ اجرٹن صاحب بہادر گئے ہوئے تھے۔ ان کو خط لکھا۔ جیسا وہ حکم دیں گے اس کے موافق کروں گا جب بلائیں گے تب جاؤں گا۔ دیکھو اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو۔ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا! بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا، پھر کس ڈھنگ سے کہ وہ آج سلطنت کا دہندہ ہے۔ میرے تعقد کا حکم بھجوایا حکام سے مجھ کو عزت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا۔ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا!

۲۹ دسمبر ۱۸۵۹ء لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا، ان کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرٹری بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ خط بھی گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ ۳۰ دسمبر کو پھر گیا۔ خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو۔ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیام ناامیدی جاوید ہے۔ نہ دربار نہ خلعت نہ پنشن۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اتنا مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک دیا سرکار سے ہوگا یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے، اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔

حافظ ممّو

حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے، حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اپنی

املاک مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف اُن کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر ہے۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی، حاکم نے پوچھا "حافظ محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ "میں!" پھر پوچھا کہ "حافظ ممّو کون؟" عرض کیا کہ "میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممّو ممّو مشہور ہوں۔" فرمایا: "یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممّو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟" مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے۔

جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینہ برسا، یعنی سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں۔ آبادی کا آوازہ پُرزور ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں، کئی ہزار گھر کی بستی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہوگا۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ رکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی

یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں اُنھیں ڈھا دو اور آیندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے۔ بقدرِ مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر بسنے کی کون سی صورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الحکم للّٰہ والملک للّٰہ۔

سکّہ کا الزام

بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے خیالی و نمک حرامی کا دھبّا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گورنمنٹ یا گورنری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسداللہ غالب نے یہ سکّہ کہہ کر گذرانا:

بہ زر زد سکّہ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا: "غلط لکھتا ہے! بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گذرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گذرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔"

اس وقت تو چپکا ہو رہا، اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی مد بکار لکھی کہ یہ جو اسداللہ خاں نامی فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے۔ اس سے کام نہیں نکلا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکّہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔

غرض اس مقصود سے یہ ہے کہ میں یہاں موجود ہوں۔ اور محلّے سے راہ و رسم ہے۔ یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ تاریخ رو بکاری کیا ہے اور یہ صدر کو بھیجی گئی یا نہیں۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کمشنر

جدید سے ملوں گا، اسی سے، اگر دے گا تو نقل لوں گا۔ جواب ازراہِ احتیاط اسی کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں ـــ میں تو کل علی کر رہا ہوں، جیوں تو اد مروں تو۔ کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے نکل جاؤں، یہ دو روپے روز بھی اُس غاصب ملعون کی گود میں جائیں۔ جس نے مجھے دس ہزار روپیہ سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنۃ والعذاب۔

یہاں میر احمد حسین والد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت جب بہادر شاہ تخت پہ بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکّہ سنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی وہاں اس سکّے کا گذرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء میں ہوا ہے۔ میں نے اکبرآباد، فرخ آباد، مارہرہ، میرٹھ اپنے احباب کو لکھا۔ اکتوبر، نومبر دسمبر ۱۸۳۷ء تینوں مہینوں کے بارہ پرچے دیکھے جائیں۔

سکّے کا وارد تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزرانے، بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے انھوں نے دلّی اردو اخبار میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سُنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گذرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلّی اردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبّا مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، موافق رضائے الٰہی ہوا، اس کا گلہ کیا:

چُوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داورست
بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے ورنہ خیر۔ کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدہا ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بھائی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

اب تم روداد سنو۔ عرضی میری سر ہنری لارنس چیف کمشنر بہادر کو گذری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیجدی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق قاعدہ کے خط لکھتا، یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی بہادر سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ کلکٹر صاحب کے پاس آیا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں نہیں پایا گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے، ان کو حکم دیا اور دربار عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا! چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہیں پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادت قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا، مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں، دوسرے دن پھر گیا، میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ یاد فرمہ

پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہو گیا لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اپیل دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار اور خلعت واگذاشت ہو گیا مگر دلی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں ملیں اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خیر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے، دربار کیا، میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عنایت کیا۔

پنشن کا مقدمہ

یہاں پنشن کا مقدمہ درپیش ہے۔ کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس، کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے۔ خود نہ جاؤں، تو خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کسی وقت کوئی پرسش آجائے۔ بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے۔ کیا کھاؤں اور کیونکر جیوں۔ للہ الحمد کہ گنہگار نہیں ٹھہرا۔ پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورنمنٹ کے پولیٹیکل سررشتے سے مقرر کی ہوئی ہے، سو دہلی کا ایجنٹی دفتر فرد فرد لٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطے میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔ اسی دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزت کا نام و نشان ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں، کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں، یہ بھی نکل جائیں گے ؎

کارہا آساں شود اما بہ صبر

پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند، اور یہ سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب سنیے اُدھر کی۔ ۱۸۵۹ء سے بموجب تحریر وزیر عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہگار ہوں، گنہگار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں، مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پنشن کا [illegible]

کلکتے میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے۔ بقلم چیف سکرتر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں، ایک پیشکش گورنمنٹ اور نذر شاہی ہے۔ نہ اس کے قبول سے اطلاع نہ اُس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکرتر بہادر لفٹنٹ گورنر ہوئے، یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالی شان چیف سکرتر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرتر کا کام کس کو دے گئے؟

۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے جو بتوسط لارڈ ایلن برا سائل نے بھجوایا ہے خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی مسلّم ہے۔ یہ حکم ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمہ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے نوید تحسین نہیں تو ولایت کو نذر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے قطع نظر نذر کے ولایت جانے کا یقین کیونکر حاصل ہو؟ جہاں یہ تفرقہ اور بے اتفاقی اور یہ دشواری اور یہ مشکل ہو۔

میرے پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کماہو حقہٗ سمجھ لو۔ و للہ حسن الطافہٗ خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دلی سے فلاں شخص کے پنشن کے چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کی روبکار منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو، تاکہ ہم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ یہاں کمشنر صاحب بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپے کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے

منگوا لو۔ میں نے کہا صاحب یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو۔ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا۔ اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر نہ آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔

پر یار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اسکی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے۔ مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں؟ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟

میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ ایک دستنبو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ نواب بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا، وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ اور یہ بھی توقع پڑی کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آ جائے۔

میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنشن کے اجرا کا حکم دیا۔

زر سالہ مجتمع، ہزار دل کہاں سے ہوئے، سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں، تین برس میں دو ہزار دو سو پچاس ہوئے، سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے۔ وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار، میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرضدار قدیم ہوں۔ اب وہ دو ہزار روپے لایا، اُس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اُس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اس سے حساب کر دیا

گیا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے؟ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دیدو، پانسو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے۔ نو سو باقی رہے، آدھے تو لے لے، آدھے مجھ کو دے دے۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے پہنچے۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں حکم ہوگیا کہ پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ بماہ پنشن نہ تقسیم ہوا کرے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے گر دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑہ سالانہ عوضاً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپے مہینہ آیا۔ باسٹھ آنے کے ساٹھ رہیں۔ کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدیں مل کر خوش و ناخوش گذارا ہو جاتا ہے۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں کیا دھرا تھا جو کوئی لوٹے گا۔ چند گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا۔ اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے باتفاق ہو کر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔ مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ ۱۸۶۲ء میں چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگے۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں تین یہ سات اور۔

۷ نومبر، ۱۴ جمادی الثانی (۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ اور قیدِ جسم سے آزاد ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

ہندوستان کا بغداد

ہائے لکھنؤ، کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری۔ اموال کیا ہوئے۔ اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا۔ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر (سید محمد)

کی سرگذشت کیا ہے۔

لکھنؤ کا کیا کہنا ـــــ وہ ہندوستان کا بغداد تھا، وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سر و پا وہاں پہنچ گیا، امیر بن گیا۔ اللہ اللہ اس باغ کی یہ فصلِ خزاں! اگر وہاں بعد فساد کے ایک کرن ہو گا یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے جو دیکھے گا وہ داد دے گا اور دلّی کے فساد کے بعد کرن نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے، سراسر بگڑ گئی اور بگڑتی جاتی ہے۔

پانچ لشکر

دلّی پر پانچ لشکروں کا حملہ ہوا۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدامِ مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج (۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء) اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو اگر کبھی کبھی تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔

برسات خدا کا قہر ہے۔ قاسم خاں کی گلی، سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا، مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان، سب

تشت خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی۔

واہ رے بندر

پنجشنبہ ۲۵ مئی (۱۸۶۵ء) کو اول بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبے کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ انشاء اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں۔ اور ہندوؤں کی ڈیوڑھیوں پر جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں ایک شہ زور ناور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے، مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام گمٹی کہتے ہیں۔ انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر!

سفر رامپور

ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اس روپے کی رسید نہ لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے۔ میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو، کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعے کی آمد مفقود۔ انگریزی پنشن مسدود، یہ بزرگوار وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔

نواب یوسف علی خاں بہادر اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس کے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ دو سو روپیہ مہینہ یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

میں نے دلی کو چھوڑا اور رامپور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو مراد نگر اور جمعہ

۲۰ جنوری کو میرٹھ پہنچا۔ شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں شیفتہ کے کہنے سے مقام کیا۔ شاہ جہاں پور، گڑھ مکتیسر، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ چار دن والیٔ شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ بحسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام، محلّے کی اور عرف کی حاجت نہیں۔

نواب صاحب مانع رہے اور بہت دریغ کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ رمضان کی چاند رات کے دن یہاں پہنچا۔ ایک شنبہ کو غرّہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ وا کیا اچھی طرح بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو: لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔

قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ ماہانہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔ سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس بہرحال غنیمت ہے۔ رزق اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا۔

تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل

ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی۔ سبحان اللہ ایسا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔

میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ کو یہاں آ گیا تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک شخص کا قول ہے کہ یہ شخص والی رامپور کا استاد تھا، اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا۔

رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں معین نہیں ہوں جس طرح امرا واسطے فقراء کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں اسی طرح اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں، چاہوں اکبرآباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں، کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں، دو یہاں چھوڑوں دو ساتھ لوں چل دوں، رام پور سے جو لفافہ آیا کریگا۔ لڑکوں کا حافظ او رد بھیجا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے، شراب مل سکتی ہے، کہار ہم پہنچ سکتے ہیں، طاقت کہاں سے لاؤں۔ روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محلسرا میں کہ وہ بہت قریب ہے جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آ کر ہوتا ہے۔ والی رامپور نے مرشد زادے

کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں، تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔

سال گذشتہ (۱۸۶۳ء) ان کو لکھ بھیجا کہ

اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے تو میں سکّہ بلبر سہی ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر ۱۸۶۴ء تک آئی۔ اب آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب ازراہ جواں مردی دیے جاتے ہیں۔

دوسرا سفر رامپور

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار اور روزینہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا، دعا گوئے دولت کو دیر دولت پر جانا واجب ہوا۔ ۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو پنجشنبہ کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی، ہاپوڑ کو روانہ ہوا، دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا، میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا، دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی، شراب پی، کباب کھائے، لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار پانچ بجے کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے باؤگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ بعد قطع منازل ستہ ۱۳ اکتوبر کو وہاں پہنچا۔ موسم اچھا تھا۔ گرمی گزر گئی تھی، جاڑا ابھی چمکا نہ تھا۔ عالم اعتدال آب و ہوا، سایہ و سرچشمہ جا بجا، آرام سے رامپور پہنچا۔

۲ نومبر نواب صاحب دورے کو گئے۔ فرما گئے کہ دو ہفتے میں آ جاؤں گا۔ آ کر چار روز یہاں

رہیں گے۔ پھر نمایش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔ وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ ۵ دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن تک جشن رہے گا۔

جشن کی وہ شان کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند مصاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ سہ شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۶۵ء کو حضور پُرنور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ روشنی و آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔

دلیں کی تصویر کھینچتا ہوں، قد، رنگ، شکل، شمائل، بعینہٖ ضیاءالدین خاں، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفاوت۔ حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعر فہم سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف متوجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائے طباطبائی کا طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک ادنیٰ روح قالب میں آئے۔

میں یہاں خوش اور تندرست ہوں، دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں، خمیری چپاتیاں، مربے، اچار۔ میں خوش، لڑکے بھی خوش، دستقا شغلی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ تعظیم، تواضع، اخلاق کسی باب میں کمی نہیں۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ کھانے کے اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہوگئی۔ لیکن اس میں میرا فائدہ

بے نقصان نہیں۔

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیۂ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی آنکہ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ، بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے، مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ مصطفیٰ خاں صاحب بتقریب تہنیت مسند نشینی و شمول جشن آنے والے ہیں، اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔

رہی مصاحبت، اس کیلئے پہلے حسن پھر علوم رحیہ سے آگہی۔ پھر زبان آوری اور قسمت کی یاوری شرط ہے۔ باقر علی خاں کو تین شرطیں درکار۔ پہلی شرط موجود۔ بعد جشن وقت رخصت ان دونوں کے باب میں کلام کروں گا۔

نواب صاحب، کھچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاڑے، گھر کو آئے۔ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء دوشنبے کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ بعد روانگی کے مرادآباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے تیمارداری اور غمخواری بہت کی۔

مذہب

میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم

ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن، ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام:

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقے کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ نہ مجھے خوف مرگ نہ دعوے صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدۂ قدریہ جبر ہے ——— صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲۔

میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم کی۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں:

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔ رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مدارج و مراتب ہیں۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

مکان

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں، مارچ ۱۸۵۲ء سے بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرائے کے

واسطے نہ تھا۔ صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کردو۔ دس بارہ برس سے اس تنگ نائے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپے یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کردو، مکان کہیں ملے تو اٹھو۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے اس میں پاٹہ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا، گرمی کی شدت، پاڑھ کا قرب، گمان یہ گذرتا تھا کہ شکنجہ ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گذریں۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہم دگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا ہو، ایک دیوانخانہ ہو۔ نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔ نواب علاؤ الدین خاں علائی کی چھوٹی پھوپھی نے بے کس نوازی کی۔ کرڈٹا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی (۹ جولائی ۱۸۶۰ء) ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محل سرا سے قریب ہو، مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔

میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی ۱۸۶۴ء سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا دالان جو میرے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے، مرنے جینے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی، کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگال دان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیئے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔

دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک

اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔

نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے، بعض فارسی خط پر محلے کا نام نہیں ہوتا، انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی، ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے اُن کی بلا، آپ ہی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے، اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو جائے۔

ملازم

بی وفادار باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور منسار ہیں، رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب سے وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف شہر کی سیر نہ کریں، ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کالی کے ہیں" (تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

اولاد

میں نسلِ بلند و لحد نوند ہوں، اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، وہ میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا۔

وبا

الحمد اللہ ایک۔ وہ ہیں کہ دو بار اُن کی ہڈیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو، وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت۔ ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تُف بریں وبا!

قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل عام ایسا، لوٹ ایسی سخت کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرما دیا تھا:

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

عزیز و اقارب

میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا۔ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔

میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال باندہ کا چچا تھا۔ وہ میرا ہمشیر بھی تھا۔ یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔

علی بخش مرحوم (میرا برادر نسبتی) مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ اس نے ۶۶ برس کی عمر پائی۔ نئی تحریر و تقریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ لارڈ لیک کے لشکر میں موجود تھا اور جو لڑائی سے جو محاربات ہوئے ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں تو سارا بدن "ٹکڑے ٹکڑے" ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی۔ ان کو دیکھ کر کہنے لگے کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار پانچ برس کے ہو گے۔ یہ سُن کر آپ نے کہا کہ "درست، بجا ارشاد ہوتا ہے!"

خدایش عمر زاد و بدیں دردہائے بے نمک نگہداراد

احباب

اللہ اللہ، اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ میں نے اُن کو دیکھا نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا، نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت، نہ اُن کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر فقیر ہوں، جب تک جیوں گا دُعا دوں گا، تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔

نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ہیں۔ ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ بمجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔

حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دے دیا۔ نوکری موقوف، جایداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جایداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرائے پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے، کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپے مہینے کی آمد لیکن چوں کہ امام بخش کی اولاد اُنکی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہٰذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے، غنیمت ہیں۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کا مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہو لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا، سچ، اُس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو رائج آتا اور فارسی میں شعر کہنے کی رغبت دلاتا۔ یہ بھی اُن ہی میں ہے جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے، کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

وبا کی بیخ دہم ہو گئی، الور میں بھی وبا ہے۔ پان سات دن بڑا شور رہا۔ الگزنڈر ہیڈلی مشہور بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس جُرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر یہ عالم اسباب ہے اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

آم

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کرکے مشہور ہے، اچھا ہوتا ہے۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ لذیذ، خوشبو، افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔

شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں، طاقت کہاں سے پاؤں، آموں کی طرف رغبت، نہ معدے میں اتنی آموں کی گنجایش۔ نہار مُنہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں: بین العشائین ؎ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا ہوں۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں۔ اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں۔ مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات ؎

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت   جوانی مگو زندگانی گذشت

شراب

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام، یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی تھی، اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔ لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔

بیس برس آگے کی یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں یا پیش از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی میں مجرا نہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس بلائیں جو ہیں بڑے بڑے مینو بہت۔ پینا ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی۔

غذا

بہتر برس کا آدمی، پھر وہ بھی دائمی، غذا ایک قلم مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی نہ بوٹی، نہ پلاؤ نہ خشکا۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے ہوئے پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ میر تقی کا یہ شعر میرے حسب حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی، حافظہ معدوم مشہور یہ بات ہے کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، موتی کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے۔ ایسے

میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا تولوں پہ منحصر تھی۔ اب ماشوں پہ ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی۔ اب دنوں پہ ہے۔ سترا بہترا اردو میں ترجمہ پیر خرف ہے۔ میری بہتر برس کی عمر ہے، پس میں "اخرف" ہوا۔ گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی طرح معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں، رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔

ضعیفی

میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے، مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں۔ لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں، سراب ہے، ہستی نہیں پندار ہے۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو ہو گا۔

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی۔ گرانی رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاودیہ ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میں مریض نہیں ہوں، بوڑھا ہوں اور ناتواں۔ گویا نیم جاں رہ گیا ہوں۔ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا، کہنے لگا: "ہائے بڑھاپا"۔ اِدھر اُدھر دیکھا، جب جانا کوئی نہیں ہے، کہتا ہوا بڑھا کہ "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے!" ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ کوئی کام دین کا نہیں کیا۔ افسوس! ہزار افسوس!!

ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع!!

گویند از ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری؟ فرمود: "کدام حال خواہد بود کسے را کہ خدا از وے فرض طلبد و پیمبر سنت۔ و دشمن مال خواہد و ملک الموت جان"

جہاں تک ہو سکا، احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں، شاہ شرف علی بو قلندر کو بسبب کبر سن خدا تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔

سروچراغاں

کیا کروں، ایک برس سے عارضِ فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سروچراغاں ہو گیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اُٹھ کر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے قطعی چوکی بھی، مگر کئی قدم جانا، پھر آنا، کیا ایسا آسان ہے؟ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ، آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں، دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ میں تو کوئی دن کا

مہمان ہوں، اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں۔ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو ان کے اخبار میں میں نے اپنا مفصل حال چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔

۲

اُردو مکتوب نویسی

فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — وہ عناصر میں اعتدال کہاں

سب کو ان سے خط و کتابت رہتی ہے۔ اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ ان میں جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں، ان سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتیب و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں، رسالوں، نسخوں اور کتابوں کے مجموعے شیرازہ بستہ چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے۔ جان کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق دربارے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموعے و یک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں انھیں کو جناب احدیت جلّت عظمتہ، مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع ارباب فن فرمائے۔

اگلوں کے خطوط کی تحریر کی طرز — ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ

لکھوں وہ خط ہی نہیں ہے، چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ
بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو، تم جانتے ہو، ہم زندہ ہیں۔ امر
ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ
مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے
لیا کرو۔

میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا میں نے
جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب
سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط
لاتا ہے، ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور
جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔

ایک لطیفہ نشاط انگیز سُنیے: ڈاک کا ہرکارہ جو بَلّی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے۔ ان
دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا، حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے۔ میں بالاخانے
میں رہتا ہوں، حویلی میں آ کر اُس نے داروغہ کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی
عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو۔ آپ کو جیسا کہ بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا اب
کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران، یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامہ غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم
"مخدوم نیاز کیشاں" لکھا تھا، اس قرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشاں"
کو "کپتان" پڑھا۔

فولاد میں جوہر

میں کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں،
بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علما سے پوچھنے کا محتاج اور
سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے اور اس

زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہلِ پارس
میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کا مولد ایران اور میرا مولد
ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دو سو چار سو آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔
اہلِ ہند میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے کوئی مُسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں
کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ
لکھ دیا۔ نظامی، سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت
جانیں۔ گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔

ایک سپاہی زادہ، ہیچمدان اور دل افسردہ۔ ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان
سے لگاؤ رکھتا ہوں۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے
معنی کے پرداز میں میرا قول اکثر خلافِ جمہور پائیے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ میں
پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں؟ اور ان کا
کلام وحی ہے؟ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں، میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس
غلط ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔

شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنورانِ ہند
میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں۔ اہلِ ایران میں رودکی و فردوسی سے لے کر جامی تک
اور جامی سے صائب و کلیم تک، کسی نے لغت کی کوئی کتاب لکھی ہو، کوئی فرہنگ جمع کی ہو
تو ہمیں دکھاؤ۔ اس کو اگر نہ مانوں اور سند نہ جانوں تو گنہ گار۔

جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں نام ان کے کہاں تک لوں۔ مشہور و غیر مشہور۔ کچھ کم
سو رسالے ہوں گے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہلِ زبان نہیں ہے۔
اشعار اساتذۂ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے۔ بمناسبت مقام ان لغات
کے معنی لکھ دیے۔ استنباطِ معنی کا مدار قیاس پر۔ میں نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط ہے

میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔

کلیاتِ نظم فارسی

فارسی کا دیوان دس ہزار بیت کا ہے۔ بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا، پھر نہیں چھپا مگر ہاں سال گذشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں۔ یعنی کوئی مصرع میرا اُن سے خارج نہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں، ہاتھ آجائے تو پینٹھ بھیج کر جلدیں منگواؤں۔

ابرِ گہر بار

ایامِ شباب میں کہ بحرِ طبع روانی پر تھا، جی میں آیا کہ غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیئے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستان طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اس آٹھ سو نو سو شعر کو چھپوا لیا۔

پنج آہنگ

میرا ایک نسبتی بھائی ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں سلمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہا۔ چنانچہ مجموعہ نثر اور کلیاتِ نظم اُردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے وہ کتب خانہ، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا۔ ایک ورق نہیں رہا۔ ہاں چھاپے کی پنج آہنگ اب بھی بکتی ہیں اور معیوب و بدعیب ہیں: ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں، دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کر دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

پرتوستان

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہ نیم ماہ" بھیجنے کا حکم دیتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب وہ 'مہر نیم روز' کی عبارت کو نہیں سمجھے تو ماہ نیم ماہ کو لے کر کیا کریں گے۔ مہر نیم روز کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام پرتوستان ہے اور اس کی دو مجلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقتِ عالم سے ہمایوں کی سلطنت کا ذکر۔ دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام مہر نیم روز، دوسرے حصے کا نام 'ماہ نیم ماہ'۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا، چھاپا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تیمور تک کا نام و نشان مٹ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔ جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو وہ بھیجوں کہاں سے؟

وہ آسمان ہی ٹوٹ پڑا جس پر ماہ نیم ماہ طلوع کرتا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح مسافر سفر میں آدھی منزل طے کر کے دم لیتا ہے، میں نے آدم سے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا کہ اب جلال الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا کہ ناگاہ یہ فتنۂ عظیم رونما ہوا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔

پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، قاطع برہان، دیوان اُردو۔ یہ پانچ رسالے البتہ کتب میں شمار کیے جائیں۔ باد مخالف ایک مثنوی ہے۔ من جملہ اُن مثنویوں کے جو کلیاتِ نظم فارسی میں مندرج ہیں۔ بجائے خود کتاب نہیں ہے۔ مثنوی ابر گہر بار بھی کلیات میں موجود ہے۔

دستنبو

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔ صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔ اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا۔ اُس کو

جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔ التزام اس کا کیا ہے۔ کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی کا نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی ہندی جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً "منشی ہرگوپال" منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "مشیوا زبان" لکھ دیا ہے۔ میرا خط نہ چھدرا نہ گنجان۔ اوراق بے مسطر یا اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس اور کسی صفحے میں بائیس سطر بلکہ کسی میں ۱۹ سطر بھی آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی میں ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔

یہ پندرہ سطر کے مسطرے چار جزکی کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی۔

منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا، اس کو میں نے لکھا، اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی۔ فارسی قدیم اور بہ کثرت حسنِ معنی اور صنعت الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔ میں پہلے سے مقاموں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرائے ملک دارا دربان کے دو سرٹیفکیٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بتفصیل معلوم کیا چاہیے تو اسی کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے۔

آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی اور میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبان انگریز

کی خریداری آئی ہوگی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ یہ سب میں کم کی ہوں گی۔ میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر دو جلدیں اور ایک جنتری منگوائی۔ پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو بھجوائیں اور اس کے بعد اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں سرد ھنے کو بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور لے چکا ہوں مگر نقد، ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائیں۔

دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔ ان کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ پھر سمجھا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں: نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بد وضعی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن بہادر کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ ایک جلد ان کی نذر بہت ضروری ہے۔

۳۳ کتابیں بھیجی ہوئی منشی شیونرائن کی، جمعہ کے دن ۱۲ نومبر (۱۸۵۸ء) کو پہنچیں کاغذ اور سیاہی اور خط کا حُسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی۔ حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو برآنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گذرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلد یا بند بھی ہوئی دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔

بندہ نے دستنبو جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی، سو ان کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی بطریق ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹننٹ گورنری کی

قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید، نظم کی تعریف، اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا۔ اُن کا مُہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آگیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔

قاطع بُرہان

ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں، یہ دکن کا آدمی یعنی جامع برہان قاطع احمق اور غلط فہم اور معوج الذہن ہے مگر قسمت کا اچھا ہے۔ مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجہ بید کے برابر مانتے ہیں۔

اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا، ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر یہ ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے۔ جو صاحب اس کو دیکھیں گے وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف برہان قاطع کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فن لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم ہو، چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو، پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچہ و خاتمے میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ طرز عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش ظرافت سے خالی نہ ہوگی۔ گذارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن بچپن سے سخن گذاری ہوں۔ مبدا فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے

فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ فارس کے منطق کا بھی مزا ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد و تربیتِ استاد سے حُسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا۔ فارسی کے غوامض جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔ قاطع برہان کا لکھنا کیا تھا گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا ہے۔ یہ ننگ، یہ معارضہ اکابر سلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ قاطع بُرہان کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت بُرہان قاطع و قاطع بُرہان ایک نمط ہے۔ بُرہان قاطع نے کیا لٹھا تین سکھ قطع کیا ہے جو آپ نے اس کو قاطع کا لقب دیا ہے۔ برہان جب تک غیر کی کسی برہان کو قطع نہ کرے گی کیونکر برہان قاطع نام پائے گی۔ برہان قاطع کی صحت میں جتنی تقریر کیجئے گا وہ قاطع برہان کی صحت کے ثبوت میں کام آئے گی۔ ۱۸۶۲ء میں برہان قاطع چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مول لیں۔

درفش کاویانی

میرے پاس روپیہ کہاں جو قاطع برہان کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب مغفور (یوسف علی خاں ناظم) نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے۔ تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو بھیجیں گے۔ وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا۔ مصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔

اس مرحوم کا وعدہ سررشتہ دفتر سے نہ تھا جو از روئے دفتر اس کی تصدیق ہو۔

قاطع برہان میں یاد و مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا اور درفش کاویانی اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا۔ رامپور سے آکر (۱۸۶۶ء) تین سو جلدیں درفش کاویانی کی تیار پائیں۔

مؤید بُرہان

میں بعنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ نام اس کا "مؤید برہان" ہے۔ اس رسالے

س دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں، اور تحریر پر کچھ اعتراض وارد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ
شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوا دیا اور
ی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں درفشِ کاویانی علاوہ اوراق مذکور بھیج دیے۔

نامۂ غالب۔ اثر غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا
ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم چشم
یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش
صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اُن کا شاگرد بناتا ہے۔ میں کہتا ہوں
وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ نامۂ غالب صاحبِ مطبع نے
اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپا، میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں، اور دور و نزدیک بانٹ دیں۔

لطائفِ غیبی۔ میں نے اپنے صرف زر سے لطائفِ غیبی کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالکِ مطبع
نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ بیس میں نے مول لے لیں۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لے لیں۔ دس
مصطفےٰ خاں صاحب نے لے لیں۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔

محرقِ قاطع۔ میں اس محرقِ قاطع کا جواب کیا لکھتا۔ مگر یاران سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا، ایک
صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اُردو زبان میں دو رسالے
جدا جدا لکھے۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق ہے دافعِ ہذیان و
سوالاتِ عبدالکریم اور لطائفِ غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور محرق کو دھونڈ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا
بھی ہے۔

دافعِ ہذیان۔ مولوی نجف علی صاحب سے میری ملاقات نہیں، صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا
سے انھوں نے دافعِ ہذیان لکھ کر فنِ سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ مولوی صاحب مرشد آباد بنگلے
میں ہیں۔ نواب ناظم نے اُن کو نوکر رکھ لیا ہے، ہر شخص نے بقدرِ حال ایک ایک قدرداں پایا
غالبِ سوختہ اختر کو ہنر کی داد بھی نہ ملی:

کسم بجود نہ پذیرفت و دہر بازم برد　　چو نامہ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

ساطعِ بُرہان۔ وہ ایک لڑکے پڑھانے والا، ملّائے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس
کا نام۔ وطن اصلی سردھنا اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے۔ آٹھ دس برس سے
اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش کا شاگرد اور
فارسی شعر کہتا ہے۔

سبد چین۔ میں نے سبدِ چین کی ایک جلد مع عرضی، اقبال نشان میر تفضل حسین خاں کی معرفت
الور کو بھجوائی تھی۔ سو حضور پُر نور مہاراؤ راجا بہادر کا خط انھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے
ازراہِ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت و
التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔

اُردو دیوان۔ میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اُردو کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں
ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان
کے لاکھوں روپے کے گھر لُٹ گئے۔ جس میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ
مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک
فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو
وہ کاغذ مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ رونا آیا۔ اردو کے دیوان چھاپے کے بہت ناقص ہیں۔ بہت
غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لُٹ گئے۔ مگر ہاں میں نے غدر سے
پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔

میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے، بارہ بیت سے زیادہ اور
نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔ ایک دوست کے پاس اُردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اُس
نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہنچائے ہیں۔ چنانچہ "پنہاں ہو گئیں"۔ "ویراں ہو گئیں" یہ
غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آ گئی ہے۔ دیوان اُردو چھپ چکا ہے۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے

نے کس کا دیوان چھاپا اُس کو آسمان پر چڑھا دیا، حُسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے، ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا، متوسط جو میرے پاس کاپی لایا کرتا تھا وہ اور تھا، اب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں، یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلی شہر میں رائے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس، قیمت چھ آنے محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔

دیوان ریختہ اس عرصے میں (بعد غدر) دلی اور کان پور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔

۳

طرزِ بیدل۔ ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسداللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کر دیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نے ایک نئی زمین نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے   کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اَور کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔

حاشا ثم حاشا اگر یہ غزل میری ہو:

اسد اور لینے کے دینے پڑیں گے

اس فریب کو میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفائی   مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں، یہ غزل اُن کے کلام معجز نظام سے ہے اور تذکروں میں مرقوم۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے، ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔

بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیشِ نظر رکھ لیے ہوں، صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ کہنے لگا۔ شاعری معنی آفرینی ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

سہل ممتنع۔ سہلِ ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع کمالِ حُسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خود ستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے گا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے

دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آتی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔

تاریخ و معمّا۔ تاریخ گوئی و معمّا سے بیگانۂ محض ہوں، اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سُنی ہوگی، فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں، اُن کا حال یہ ہے کہ مادّہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادّہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ وہ ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادّہ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈھ لا دیتے، موزوں میں کرتا۔ اگر آپ مادّے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آگئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہوگئی ہے۔ کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج علی خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعا سے تاریخ کی۔ میں نے لکھی۔ چنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے

مفتیِ عقل از پئے تاریخ ایں بنا	ایما بسوے من زرہ احترام کرد
گفتم بوے بدیہہ "خوشا خانۂ خدا"	شد خشمگیں و مے کہ نظر در کلام کرد
خاشاک رفت و پاے ادب در شکنجہ ریخت	ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو۔ "خوشا خانۂ خدا" مادّہ، پھر اس میں سے خاشاک کے عدد دور کرو؛ نو سو اکیس کا تخرجہ، پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ پاے ادب یعنی ب کو گرا دیا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے!

مگر ہاں حساب کے قاعدے سے باہر کچھ معنی سنگالی کے طور پر میرا ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۴۸ھ میں مرا۔ اس کی تاریخ میں نے لکھی:

ز سال واقعہ میرزا سیتا بیگ	آنت راست شمار ائمہ امجاد
صحیفہ ہائے سماوی مبیّن از عشرات	حدیقہ ہائے بہشتی مشخّص از احاد

ائمہ بارہ یعنی بارہ سو، پھر کتب سماوی چار، دہائی کے چار یعنی چالیس، بہشت آٹھ۔ چالیس اور آٹھ اڑتالیس۔ بارہ سو اڑتالیس۔

دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی:

از بروجِ سپہر جوی آیات	عشرات از کواکب سیار

بروج بارہ۔ سات دہائی کے ستّر

اصل فطرت میں میرا ذہن تاریخ و معمّا کے ملائم و مناسب نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں از راہ شوخیِ طبع گنتی کے عامیانہ معمّے لکھے ہیں۔ وہ مبادی کلیات فارسی میں موجود ہیں۔

۴

اپنا تماشائی۔ اگرچہ یک فنا ہوں۔ مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے:

دلبستان سرائے نہ میخانۂ	نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط	نہ غوغائے رامشگراں در نشاط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی اپنا آپ تماشائی ہوں

گیا ہوں۔ مدح و ذم سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جُوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں ہے، اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ اپنے کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

کافرِ مطلق ۔ کہتے ہیں خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافرِ مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین!

اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا بالکل مجھ سے چھوٹ گیا، اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیونکر کہا تھا۔

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ نہ کی ہے۔ شعر سننا تو ممکن ہی نہیں شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔ بقول انوری ؎

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعرا اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔

زندہ در گور۔ میں اب انتہائے عمرِ ناپائدار کو پہنچ کر آفتاب لبِ بام اور بہجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ رُوحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیئے۔ نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزدِ دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔

اس نمایش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالمِ بے رنگی کا مشتاق ہوں۔

لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ۔ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

ہر دم نزع ہے، دل غم سے خوں ریز ہو گیا ہے۔ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔

مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔

کمالِ یاس مقتضیٔ استغنا ہے۔ پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامیدِ مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں کہ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے، مرنے کا زمانہ کوئی بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال — مُرد غالب بگو کہ غالب مُرد
۱۲۷۷ھ

اب بارہ سو پچھتر ہیں اور "غالب مُرد" بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچتی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔

۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

ہجومِ غم ہائے نہانی کا کیا ذکر کروں، جیسے ابرِ سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے ؎

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو بس اللہ ہی اللہ ہے

GHALIB SPEAKS

(Autobiography of Ghalib)

15

Compiled by

Nisar Ahmed Faruqi

Delhi College, Delhi 'Varsity, Delhi-6

1970

'ILMI MAJLIS'

1429, Farrash Khana, Delhi-6.

Rs. 2-50

زندہ درگور- میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور بہجوم امراض جسمانی و آلام رُوحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیئے۔ نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔

اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔

لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

ہر دم نزع ہے، دل غم سے خوں ریز ہو گیا ہے۔ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔

مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔

کمالِ یاس مقتضیٔ استغنا ہے۔ پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ باُمیدِ مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں کہ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال — مُرد غالب بگو کہ غالب مُرد
۱۲۷۷ھ

اب بارہ سو چھتر ہیں اور "غالب مُرد" بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچتی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔

۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

ہجومِ غم ہائے نہانی کا کیا ذکر کروں، جیسے ابر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو بس اللہ ہی اللہ ہے